© rasailojaraid.com

احیاے اسلام: چیلنج اور امکانات

پروفیسر خورشید احمد

ترجمہ: مسلم سجاد

امریکہ کے ورلڈ اینڈ اسلام اسٹڈیز انٹرپرائز (WISE) نے یونی ورسٹی آف ساؤتھ فلوریڈا کے تعاون سے احیاے اسلام پر مسلم دنیا کی معروف شخصیتوں سے مکالمہ کا آغاز کیا ہے۔ ۱۹۹۲ء میں سوڈان کے ڈاکٹر حسن ترابی کے ساتھ راؤنڈ ٹیبل ہوئی اور مئی ۱۹۹۳ء میں پاکستان کے پروفیسر خورشید احمد کے ساتھ۔ ایک ہی دن میں ساڑھے سات گھنٹے کی بات چیت انگریزی میں WISE نے شائع کر دی تھی۔ اسے حال ہی میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز نے شائع کیا ہے۔ (Islamic Resurgence : Challenges, Dircetion and future Perspectives) اردو ترجمہ بھی زیرِ ترتیب ہے۔ اس کا ایک باب جو پروفیسر خورشید احمد کا بنیادی خطاب ہے' ہم پیش کر رہے ہیں۔ (مدیر)

سب سے پہلے میں ورلڈ اینڈ اسلام اسٹڈیز انٹرپرائز (WISE) اور یونی ورسٹی آف فلوریڈا کا اور آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں' جنھوں نے مجھے آج آپ کے ساتھ مل بیٹھنے اور ایک ایسے موضوع پر اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا ہے جو مجھے عزیز ہے اور آپ کے لیے بھی فکرمندی کا باعث ہے۔ میرے نزدیک یہ بات بڑی اہم ہے کہ اہل علم اور دانش وروں نے ماضی کی طویل روایت کے مطابق ایک دوسرے کے بارے میں بات کرنے کے بجائے تبادلہ خیال کی فضا میں ایک دوسرے سے بات کرنا شروع کر دی ہے۔ یقیناً یہ ایک اہم پیش رفت ہے اور میرے خیال میں اس کا کریڈٹ آپ جیسے اہل علم اور دانش وروں کو جاتا ہے' جنھوں نے ایک طرح کی خود کلامی کو حقیقی مکالمہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ ہم یہاں اس لیے جمع ہیں کہ ایک دوسرے سے بات کریں' بحث کریں' اختلاف کریں اور پھر بھی اپنی بات چیت جاری رکھیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہ حقیقی سپرٹ ہے جس میں ہم آج مل رہے ہیں اور میں ذاتی طور پر آپ میں سے ہر ایک کا' تبادلہ خیال کی اس محفل میں آنے پر ممنون ہوں۔ میں اپنی گفتگو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصل موضوع یعنی احیائے اسلام کی اہم خصوصیات تک محدود رکھوں گا۔

احیائے اسلام کے عمل کو صحیح صحیح سمجھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی تصوراتی ڈھانچہ ہونا چاہیے۔ ۱۸۴۸ء میں جب کارل مارکس (م ۱۸۸۲) اور فریڈرک اینجلز (م ۱۸۹۵) نے کمیونسٹ پارٹی کا مینی فیسٹو پیش کیا' تو انھوں نے اسے بے حد دلچسپ جملے سے شروع کیا: "یورپ پر ایک آسیب منڈلا رہا ہے: کمیونزم کا آسیب A specter is haunting Europe: the specter of Communism ڈیڑھ صدی بعد آج کے لٹریچر اور میڈیا پروگرام دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے جیسے کہ "آج مغرب پر ایک نیا آسیب منڈلا رہا ہے: اسلامی بنیاد پرستی کا آسیب!" مگر ایک فرق ہے۔ کمیونزم کو آسیب قرار دینے والے خود مارکس اور اینجلز تھے' جب کہ یہ مسلمان نہیں ہیں جو اپنے نظریہ حیات اور پروگرام کو بطور آسیب پیش کر رہے ہیں۔ یہ بھی بڑی دلچسپ بات ہے چاہے اس میں کوئی سازش نہ ہو کہ اپنی فکر اور پیغام کو کمیونزم کا نام مارکس نے خود دیا' لیکن مسلمانوں کو یہ اختیار بھی نہیں دیا گیا ہے کہ ان کا مذہب اور تہذیبی نقشہ اس نام سے پہچانا جائے جو وہ خود اسے دیں' یہ حق دوسروں نے خود ہی حاصل کر لیا ہے کہ وہ ہمارا نام اور ہمارے کام تجویز کریں' اور اس طرح اسلامی بنیاد پرستی کا ہوا کھڑا کریں!

میں اپنی بات اس عزم کے ساتھ شروع کر رہا ہوں کہ آپ کے سامنے مکمل دیانت اور معروضیت کے ساتھ اپنا موقف پیش کروں' اور یہ بتاؤں کہ ایک مسلمان احیائے اسلام کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ میری حیثیت کچھ خصوصی خیالات کے لیے ایک سیلزمین کی نہیں ہے۔ میں اس علمی مذاکرے میں اس جذبے سے شریک ہوا ہوں کہ ایک طرف اپنی بات کسی رورعایت کے بغیر پیش کروں اور دوسری طرف آپ کے ردعمل اور مشاہدات سے استفادہ کروں۔ ہمارا مقصد مناظرہ اور کج بحثی نہیں' دیانت اور انکسار سے حقیقت کی تلاش اور مسلمانوں کی موجودہ فکری اور ذہنی کیفیت' ان کے تہذیبی عزائم اور امنگوں کی تفہیم ہے۔

تصوراتی پس منظر

احیائے اسلام ایک عالم گیر لہر ہے' یہ کسی جغرافیائی اکائی میں محدود نہیں۔ یہ کوئی ایسی چیز بھی نہیں جو اچانک رونما ہو گئی ہو۔ یہ ایک فطری تہذیبی عمل ہے' جسے اس کے تصوراتی اور تاریخی پس منظر میں ہی سمجھا جانا چاہیے۔

ہم مسلمان یہ ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ازل سے انسانیت کی ہدایت کے لیے جو راستہ اپنے رسولوں کے ذریعے بتایا ہے وہ اسلام ہی ہے' اور جو اس ہدایت کو قبول کر لیتے ہیں اور اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں ' وہ مسلمان ہیں ۔ ہمیں یہ ہدایت ایک مقدس کتاب کی شکل میں فراہم کی گئی ہے ' جس میں اللہ تعالیٰ کا بے آمیز کلام محفوظ ہے ۔ یہ کتاب ایک پیغمبرؐ کے ذریعے نازل کی گئی ۔ انھوں نے اسے دیانت داری سے پہنچایا ' اس کی تشریح کی ' اور اس کے احکامات اور ہدایات پر عمل ' انفرادی نمونے اور اجتماعی تحریک کی شکل میں ' کیا ۔ اس کوشش کے نتیجے میں اس خیال ' تصور اور ہدایت کو افراد کی زندگیوں میں اور ان کے معاشرے میں روبہ عمل لانے کے لیے ایک تحریک برپا ہوئی ۔

ہم یہ ایمان بھی رکھتے ہیں کہ قرآن اللہ کی آخری کتاب ہے اور محمدؐ آخری نبی ہیں ۔ اس لیے جہاں کتاب و سنت میں آفاقی حقائق ' نصب العین ' اصول اور اقدار مذکور ہیں ' وہاں اس میں ایسا طریق کار بھی موجود ہے کہ مختلف ادوار اور زمانوں کی ضروریات پوری ہو سکیں ۔ نہ یہ ہمارا دعویٰ ہے ' نہ اس نظام ہدایت میں تمام تفصیلات کی تلاش درست ہے ۔ یہ صرف بنیادی امور کو بیان کرتی ہے ' اور فرد اور معاشرے کی زندگی کے لیے یہ ایک معین نقطہ نظر اور راہ نما خطوط دیتی ہے ۔ اب یہ ذمہ داری امت کی ہے کہ اس نقطہ نظر کو اختیار کرے ' اور ان راہ نما خطوط پر چلتے ہوئے ' اس نصب العین کو زمان و مکاں میں عملاً برپا کرے ۔ اس میں ہر زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے اور تبدیلی اور اختراع کے لیے خودکار نظام موجود ہے ۔ اسی لیے ' از سر نو غور و فکر ' جدت و اختراع ' نئے حالات پر اطلاق ' ادعا اور تبدیلی کا عمل ' مسلم تاریخ کے تمام ادوار میں ایک ممتاز عمل رہا ہے ۔ آج احیاے اسلام محض چند مخصوص معاصرانہ چیلنجوں کا نتیجہ نہیں ہے ۔ اسے اس کے اصولی پس منظر ' تاریخی تسلسل اور معاصر دنیا کے چیلنجوں پر مسلمانوں کے ردعمل ' دونوں کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے ۔

سب سے پہلے ہمیں دو پہلوؤں پر غور کرنا چاہیے: ایک ' داخلی پہلو ' جو مسلمانوں کے تاریخی شعور کا حصہ ہے ۔ یہ انھیں اپنی تاریخ پر ایک منفرد انداز سے غور کرنے اور مستقبل کے لیے ایسے حل تلاش کرنے پر آمادہ کرتا ہے جن کی جڑیں ان کے اس پس منظر میں پیوست ہوں ۔ دوسرے ' خارجی ماحول ' یعنی سیاست ' علم و دانش ' معیشت ' اداروں اور فنیات کی حقیقی صورت حال ۔ مسلمانوں کو ان چیلنجوں کا بھی جواب دینا ہوتا ہے ۔

پس احیاے اسلام ' داخلی اور تاریخی ' دونوں صورت حال کا جواب ہے ۔

تاریخی پس منظر

بہت زیادہ گہرائی میں جائے بغیر ' احیاے اسلام کی حالیہ تاریخ میں تین مراحل نظر آتے ہیں: (۱) قبل نو آبادیاتی ' (۲) نو آبادیاتی ' (۳) بعد نو آبادیاتی ۔

۱۔ قبل نو آبادیاتی: میں اعتراف کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی تاریخ میں عروج و زوال اور مد و جزر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتے رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں مسلسل ترقی کا عمل نہیں رہا ہے۔ مختلف وجوہات کی بنا پر، جن میں سے بیشتر داخلی ہیں، مسلم معاشرہ، نو آبادیاتی دور سے پہلے، یعنی ۱۶ تا ۱۸ ویں صدی میں، زوال سے دوچار تھا، اور وہ پیش آمدہ چیلنجوں پر، خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی، زراعت اور صنعت، آلات حرب اور معیشت کے میدانوں میں، تخلیقی ردعمل کے اظہار سے قاصر تھا۔

۲۔ نو آبادیاتی: دوسرے مرحلے میں، جسے نو آبادیاتی دور کہا جاتا ہے، جب ہمارا مغرب سے آمنا سامنا ہوا تو ہم عالمی منظر سے پسپا ہو جانے کی وجہ سے برابر کے مقابلے پر نہیں تھے۔ ۱۹ ویں صدی کے اختتام تک تقریباً کل مسلم دنیا، ماسوائے چار غیر اہم مسلم ممالک کے، نو آبادیاتی حکمرانوں کے زیر نگیں آگئی تھی۔ اس دور میں اسلام ہی وہ محور تھا جس کے گرد جمع ہو کر، مسلم ممالک پر حملوں، مغرب کی مداخلت اور نو آبادیت کے خلاف مزاحمت کی گئی۔ جب نو آبادیاتی حکومت قائم ہوگئی تو پھر یہ اسلام ہی کا دیا ہوا سیاسی آزادی، قومی شناخت اور عزت اور وقار کا احساس تھا، جس کی وجہ سے سامراجی حکمرانوں کے خلاف مسلسل مزاحمت جاری رکھی جا سکی۔

۳۔ بعد از نو آبادیاتی: ۲۰ ویں صدی کے بعد از نو آبادیاتی دور میں، نو آبادیت کے ورثے اور معاشرہ کی تشکیل نو کے چیلنج کا مقابلہ کرنے والی بڑی قوتوں میں اسلام بھی تھا۔ میرے خیال سے آج احیاے اسلام کو اس نظریاتی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔

ان تمام مراحل میں اسلام اور مغرب کے درمیان علمی، اجتماعی اور سیاسی کئی سطحوں پر مقابلہ ہوا ہے۔ علمی لحاظ سے دیکھا جائے تو اسلام کے پاس اپنا نظریہ کائنات (ورلڈ ویو) ہے۔ اجتماعی سطح پر یہ فرد، معاشرے، معیشت اور اجتماعی روابط کے بارے میں واضح اجتماعی اور تہذیبی اقدار دیتا ہے۔ نو آبادیت کے نتیجے میں اسلام کی اجتماعی اور تہذیبی اقدار، سیکولر مغربی اقدار اور عیسائیت دونوں کے حملوں کی زد میں آئیں۔

سیاسی محاذ پر مسلمان اپنی طویل تاریخ میں پہلی مرتبہ اقتدار سے محروم ہوئے، جبکہ ماضی میں مسلمانوں نے ہمیشہ کسی ایک سیاسی محاذ پر کچھ کھویا تو کسی دوسرے محاذ پر کچھ پالیا۔ زوال بغداد اگر زوال کے انتہائی نکتہ کا اظہار تھا، تو قسطنطنیہ کی فتح ایک نئے عروج کی علامت تھی۔ اگر شرق اوسط میں شکست کا سامنا تھا تو جنوب مشرقی ایشیا، مغربی اور وسطی افریقہ اور وسطی اور جنوبی ایشیا میں وہ توسیع اور عروج کے راستے پر گامزن تھے۔ گذشتہ دو تین صدیوں میں سیاسی اقتدار سے اس محرومی نے یقیناً مسلمانوں کی نفسیات اور ردعمل کی صلاحیت کو متاثر کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں احیاے اسلام کی معاصر تحریکوں میں مختلف نوعیت کے انداز نمایاں ہیں۔ سیاسی عوامل کے ساتھ ساتھ، معاشی اور تکنیکی پہلوؤں نے بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

احیا کی نشوونما کو متاثر کیا ہے۔

میں ایک بات کی طرف خاص طور سے توجہ دلانا چاہوں گا: نو آبادیاتی دور کے دو سو برسوں میں مسلم معاشروں میں ایک بنیادی تغیر واقع ہو گیا۔ ماضی میں جب زوال سے واسطہ پیش آیا تو معاشرے کے ادارے ' خصوصاً عدلیہ 'تعلیم ' قانون 'معیشت ' خاندان اور فوج نے اپنا اسلامی تشخص برقرار رکھا۔ نو آبادیاتی دور میں ان اداروں میں سے بیشتر مغربی اداروں سے مغلوب ہو گئے یا تبدیل ہو گئے۔ مغربی تصورات اور ادارے مسلم معاشروں کے ہر گوشے میں اس حد تک دخیل ہو گئے کہ خاندان تک کو بھی 'مغربی نمونوں کے مطابق تشکیل نو کر کے 'ماڈرن بنایا جا رہا ہے۔ اسی کے نتیجے میں مسلم معاشروں میں ایک نئی قیادت ابھری ہے 'جس کی جڑیں نہ مسلم عوام میں ہیں نہ مسلم روایت میں۔ مسلمان مملکتوں میں یہ مغرب زدہ سربر آوردہ طبقہ تعلیمی اور نفسیاتی لحاظ سے اور افتاد طبع کے حوالے سے مغرب کے نو آبادیاتی نظام کے لیے بقائے باہمی کے اصول پر پروان چڑھا۔

مغرب کے تسلط کے نتیجے میں مسلم معاشرے کی تمام سطحوں پر ایک نئی طرح کی قلب ماہیت اور ایک ناگزیر بحران کا آغاز ہو گیا۔ اس تصادم کے جواب میں قوم پرستی کا آغاز ہوا۔ قومی تحریک کو برپا کرنے والا بنیادی اور ابتدائی محرک مذہب تھا 'گو کہ اس میں قوم پرستانہ اور سیکولر لہجہ بھی شامل تھا۔ قومی قیادت نے اپنا جواز اور اپنی حمایت عوام سے حاصل کی۔ مگر 'اگرچہ قوم پرستوں میں کچھ مخلص افراد بھی تھے 'لیکن قیادت کی اکثریت کی تربیت اس طرح ہوئی تھی کہ حصول آزادی کے بعد امت کی تمناؤں کو پورا کرنے کے بجائے انھوں نے قومی امنگوں کی تکمیل میں اسلام کو نظرانداز کر دیا۔ مسلم عوام نے محسوس کیا کہ ان کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ یہ پس منظر ہے جس میں احیائے اسلام نے اپنے کو پیش کرنا شروع کیا۔

میری رائے میں 'پہلی جنگ عظیم کے بعد 'کیونکہ بیشتر مسلم مملکتوں میں نو آبادیاتی دور جاری تھا ' احیائے اسلام کو بنیادی طور پر زور دینا تھا کہ مسلمانوں کو سیاسی اور علمی و نظریاتی دونوں طرح کی آزادی درکار ہے۔ نو آبادیات محض سیاسی عمل نہیں ہے۔ اس لیے نو آبادیت سے چھٹکارا ' صرف سیاسی نہیں بلکہ علمی ' تہذیبی اور معاشی عمل بھی ہے۔ یہ صرف ڈاکٹر محمد اقبال ' مولانا مودودی 'حسن البنا ' مالک بالنبی اور سعید نورسی جیسی عظیم مفکر شخصیات ہی نے نہیں بلکہ ہر طرح کے مسلمانوں نے ہر سطح پر مغربی نو آبادیاتی نظام کو چیلنج کیا۔

نو آبادیاتی تجربے کے دوران مسلم ترجیحات کا از سر نو تعین کیا گیا۔ مسلمانوں نے محسوس کیا کہ جس طرح سیاسی آزادی حاصل کرنا ضروری ہے 'اسی طرح انفرادی اور اجتماعی سطح پر اسلامی تشخص قائم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے کے لیے منظم کوشش کی جانا چاہیے' اس لیے میرے خیال سے احیائے اسلام کی موجودہ تحریک ' بنیادی طور پر داخلی تجدید نو کی تحریک ہے۔ خود شناسی اور خودگری کی تحریک ہے۔ ایک انقلابی جذبہ 'ایک عزم نو اور از سر نو طاقت کے حصول کی تحریک ہے۔ یہ تحریک مسلمانوں کو اخلاقی 'علمی ' تہذیبی اور نظریاتی لحاظ سے ان کی اصل بنیادوں تک لے جاتی ہے۔

نو آبادیاتی تسلط اور مسلمانوں کی بنیادوں کے لیے اس کے چیلنج کی وجہ سے احیائے اسلام ہر سطح پر آزادی کا علمبردار ہے۔ اس کا لہجہ سیاسی ضرور ہے لیکن احیائے اسلام بنیادی طور پر ایک مذہبی اور اخلاقی تحریک ہے۔ اس کی حقیقت ایمان کے احیا اور استحکام پر مبنی ہے' یہ اللہ تعالیٰ سے اس عہد کو تازہ کرنے کے لیے خودنگری کی داعی بھی ہے' تاکہ مسلمان روحانی ' اخلاقی اور مذہبی طرز پر زندگی گزار سکیں۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ احیائے اسلام پر بیشتر مغربی لٹریچر ان اہم حقائق کو سامنے نہیں لاتا۔ میری رائے میں احیائے اسلام کے سیاسی ' اجتماعی اور تشکیلی پہلو ' اخلاقی تجدید نو ہی کے ظاہری مظاہر ہیں' جس کے بغیر ناکامی مقدر ہے۔

درحقیقت احیائے اسلام کا منفرد کردار ' زندگی کے روحانی اور مادی پہلوؤں کی یک جائی پر اصرار ہے۔ یہی سارے مسئلے کی جڑ بنیاد ہے ' اصل مسئلہ ہے۔

میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ احیائے اسلام جس طرح مادی اور روحانی پہلوؤں کی یک جائی کرنا چاہتا ہے' بہت سے مغربی اہل علم کو اسے سمجھنے میں دقت پیش آرہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نشاۃ ثانیہ کے بعد سے مغربی فکر کا اصل دھارا روح اور مادہ کی کھلی یا چھپی تقسیم پر مبنی رہا ہے۔ انسانی معاملات میں اللہ تعالیٰ کی مرکزی حیثیت کی نفی اور عقلیت کی فتح کے نتیجے میں مغربی فکر نے معاشرہ ' طرز حکومت اور معیشت میں وحی ' اخلاق اور مذہب کے کردار کو نظرانداز کیا ہے۔ (دیکھیے: G. Vattimo, The End of Modernity Nihilism and Hermeneutics in Post modern Culture, 1988)

احیائے اسلام : روایتی فکر ، فرقہ واریت اور جدت پسندی

جدید اسلامی فکر ' جو احیائے اسلام پیش کرتا ہے ' مادہ اور روح کی یک جائی اور معاشرے اور اس کے اداروں کی اصلاح کے ذریعے روحانیت حاصل کرنے کی بات کرتی ہے۔ مادی دنیا اسی باطنی حقیقت کا اظہار ہے۔ احیائے اسلام کی ایک اور اہم خصوصیت ' معاشرے اور مذہب کا ربط بھی روح اور مادے کی اسی یک جائی پر قائم ہے۔ اسلامی فکر کے مطابق ' مذہب اور طرز حکومت ' اور اخلاق اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قانون ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قانون الٰہی ہر بات کی تمام تفصیلات فراہم کرتا ہے' بلکہ وہ راہ نما خطوط پیش کرتا ہے اور لوگوں کو متحرک کرنے کے طریقے اور رویے متعین کرنے کے لیے سیاق فراہم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام معاشروں اور اداروں میں تبدیلی لانے کو غیر معمولی اہمیت دیتا ہے۔ مغربی طرز فکر بالکل مختلف ہے۔ اس میں یہ فرض کیا جاتا ہے کہ اداروں میں 'تعلیم میں' ماحول اور ساخت میں تبدیلی سے ہمہ جہت تبدیلی پیدا ہوگی۔ اس کے برخلاف اسلامی نقطہ نظر کے مطابق اصل تبدیلی انسان کے قلب و روح میں 'تخیل میں' تحرک میں اور مستقبل کے تصور میں لانا چاہیے۔ اور پھر اسے اجتماعی اداروں' معاشرتی حقائق' سیاست' معیشت' عدلیہ سب کا احاطہ کر لینا چاہیے۔

آخری بات یہ ہے کہ احیاے اسلام 'مسلم معاشرے کے حوالے سے' کچھ روایتی رویوں میں تبدیلی کا اظہار بھی ہے۔ مثلاً ایک رویہ 'قرآن و سنت کے مقابلے میں قانون و فقہ پر ضرورت سے زیادہ زور دینا ہے۔ روایت' مذہبی قیادت پر علما کو فائز کرتی ہے' جنھوں نے یقیناً ہماری تاریخ میں نہایت درخشاں کردار ادا کیا ہے۔ عام علما رجعت پسند بھی نہیں رہے ہیں۔ لیکن ماضی میں 'ایک قسم کی قدامت پسندی بڑھ آئی' اور قرآن و سنت پر مبنی ایک مستحکم نظام قانون قائم ہوا۔ یہ قانون ہی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر حکمرانی کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ --- اور اس میں بڑا دخل اس نظام تعلیم کو تھا جس پر جمود طاری ہو گیا تھا اور وہ معاصر علمی تہذیبی اور سیاسی اثرات سے کٹ گیا تھا -- اصل ماخذ' یعنی قرآن و سنت اور مجموعہ قانون 'یعنی فقہ' میں فاصلہ پیدا ہو گیا۔ نتیجتاً قرآن و سنت سے براہ راست اخذ کی اہمیت کم ہو گئی اور قانون کی پابندی زیادہ اہمیت اختیار کر گئی۔ اس طرح جمود پیدا ہو گیا۔

اس پس منظر میں 'احیاے اسلام ایک حرکی عامل ہے۔ یہ روایت' قانون اور رواج کی اہمیت کا انکار نہیں کرتا' بلکہ ترجیحات کی ایک نئی ترتیب پیش کرتا ہے۔ اس ترتیب سے --- روایت اور تاریخی ارتقا سے اعراض یا بغاوت کیے بغیر --- تغیر کے ان تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہے جو خود معاشرے کے اندر سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ترجیحات کی نئی ترتیب کی اس شعوری کوشش کے نتیجے میں احیاے اسلام کے فکری قائدین نے ثانوی اور فروعی کے مقابلے میں بنیادی اور ضروری پر زور دیا ہے۔ اسلامی تحریکوں نے رواداری اختیار کر کے اور اسلام کے مختلف مکتبہ ہاے فکر کے درمیان اشتراک کے وسیع امکانات کی نشاندہی کر کے فرقہ واریت کے خلاف موقف اختیار کیا ہے۔ احیاے اسلام کا رویہ 'نام نہاد جدت پسندوں کے رویے سے بالکل مختلف ہے' جو بظاہر اسلام سے رشتہ قائم رکھ کر' اس طرح کی تعبیریں کرتے ہیں کہ بیشتر اسلامی احکامات اور اقدار کو مغربی کلچر اور روح کی اقدار اور ان کی علمی' سیاسی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاشی بنیادوں کے مطابق بنایا جا سکے۔ (دیکھیے: F. Rahman کی Islam & Modernity 1982) کچھ دوسرے بدعت پسند سوشلسٹ نظام کی طرف زیادہ مائل تھے۔ انھوں نے اسلامی اقدار اور احکامات کے اندر سوشلزم کی کوئی قسم پڑھنے کی کوشش کی۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ ماڈرن اسلام کو اندر سے تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی تعبیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اسے لبرلزم کی مغربی اقدار کے قریب لے آئے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اجتہاد کے اصول کو استعمال کرتے ہیں' لیکن وہ اجتہاد کی شرائط اور آداب کا لحاظ رکھنا ضروری نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی ماڈرنسٹ تعبیر کو مذہبی سند حاصل نہیں ہو سکی ہے۔

اس کے مقابلے میں اسلامی تحریکوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ 'اسلامی اقدار اور احکامات کے بارے میں کسی قسم کے احساس کمتری کے بغیر' اور قرآن و سنت کی حدود میں رہتے ہوئے 'فقہ پر دوبارہ ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ اس کے علاوہ احیاے اسلام نے یہ فکر بھی پیش کی ہے کہ مغربی تہذیب 'مغربی فکر' اور مغربی اقدار کو بند ذہن سے نہیں' بلکہ کھلے ذہن سے دیکھنا چاہیے۔ جدید مغربی دنیا میں بہت سے ایسے کام ہوئے ہیں' جو انسانیت کی مستقل میراث کا حصہ بن گئے ہیں۔ میری رائے میں مسلمانوں کو انھیں صرف اس وجہ سے نہ ٹھکرا دینا چاہیے کہ وہ مغربی ہیں۔ لیکن ان کو اپنی اقدار کے ساتھ مخلص اور وفادار رہنا چاہیے۔ وہ معیار جس پر مسلمانوں کو طے کرنا چاہیے کہ کس چیز کو قبول کریں اور جذب کرلیں اور کس چیز سے احتراز کریں اور مسترد کر دیں' ان کی اپنی اقدار ہیں۔ مسلمانوں کو اسلام کے فکری اور اخلاقی کردار کی بقا و تحفظ کا اہتمام کرنا چاہیے' اور سوچ سمجھ کر ہر اس چیز سے بچنا چاہیے جو اسلامی فکر سے متغائر اور متناقض ہو۔

یہ ہے روایات' فرقہ واریت اور تجدد کے بارے میں اسلامی تحریک کا رویہ۔ (دیکھیے: M.Berman, All That is Solid Melts into Air: The Experience of Modernity, 1988)

کچھ لوگ اسلامی تحریک کو الزام دیتے ہیں کہ یہ تفصیلات سے گریز کرتی ہے' اور یہ کہ اس کے پاس اجتماعی اور معاشی زندگی میں تبدیلی کا مفصل پروگرام نہیں ہے۔ میں اس بارے میں یہ عرض کروں گا کہ 'اسلامی تحریک نے ایک نیا علمی' سیاسی' معاشی اور تہذیبی رخ دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ سطح جس پر اسلامی تحریک اپنا پیغام دے رہی ہے' بنیادی طور پر تہذیبی سطح ہے۔ اس سطح پر پیغام دینے میں جن تفصیلات میں جانا ضروری ہے' اسلامی تحریک کو انھیں نظر انداز کرنے کا الزام دینا ناانصافی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

احیاے اسلام اور تہذیب

تہذیبی سطح پر 'اسلامی تحریک نے متعدد سوال اٹھائے ہیں: (۱) مسلم معاشرے کی حقیقت کیا ہے' اور اس کے مذہبی' اخلاقی اور تہذیبی عناصر ترکیبی کیا ہیں' (۲) معاشرے کی تعمیر کس بنیاد پر ہوتا ہے' (۳) معاشرے کے بنیادی اداروں -- مثلاً خاندان' شہر' محلے اور وقف -- کا کیا کردار ہے' (۴) اسلامی ریاست کی کیا نوعیت ہے' اسلامی دستور کے لازمی خواص کیا ہیں اور مسلم حکومت کے لیے بنیادی راہ نما خطوط کیا ہیں' (۵) قیادت کا کام کیا ہے' (۶) غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کس طرح تشکیل دیے جائیں گے' (۷) اسلامی ریاست خارجہ پالیسی میں کن امور کو آگے بڑھائے گی' اور (۸) آخری بات یہ کہ اسلامی ریاست کے لیے معیشت کا کیا تصور ہے؟

اسلامی ریاست کے ضمن میں 'ہمیں اسلامی معیشت کی نوعیت' اور اس سلسلے میں مسلمان ماہرین سیاست اور معیشت نے گذشتہ نصف صدی میں جو کام کیا ہے' اسے سنجیدگی سے لینا چاہیے۔ یہ پروپیگنڈا مواد نہیں ہے' اور نہ ہی محض نیک خواہشات کا مجموعہ۔ یہ سنجیدہ اور نتیجہ خیز کام ہے۔ بہت کام کیا گیا ہے' پھر بھی میرے نزدیک یہ توقع کرنا یا مطالبہ کرنا درست نہیں کہ مسلم قیادت کے اقتدار میں آنے سے پہلے تفصیلی نقشہ کار سامنے آنا چاہیے۔ پالیسی سازی' اجتماعی تبدیلی اور معاشی پروگرام ایک طرف' اقدار' اصول اور معیارات اور دوسری طرف عملی حقائق کے باہم تعامل سے ہی تشکیل دیے جاسکتے ہیں۔ انھیں کسی ریسرچ لیبارٹری میں تیار نہیں کیا جاسکتا۔

جدید معاشی لبرلزم کے باوا آدم 'ایڈم اسمتھ Adam Smith (م ۱۷۹۰) نے اپنی کتاب میں کوئی ایسا تفصیلی نقشہ کار نہیں دیا جیسا کہ آج معاشیات کی ایک اوسط درجہ کی کتاب میں مل جاتا ہے' نہ اس نے وہ تفصیلات بیان کیں جو ایک معاشی پروگرام میں ملتی ہیں۔ سمتھ صرف ایک نیا معاشی نقطہ نظر دیتا ہے اور ۱۸ ویں صدی کی معاشی صورت حال کی تعبیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ۱۲۰ برس بعد الفرڈ مارشل Marshall (م۔ ۱۹۲۴) نے معاشیات کی پہلی درسی کتاب لکھی' جس میں اس نے ایک جدید معیشت کی کارکردگی' اس کے اہم قوانین اور ان کے پالیسی مضمرات سے بحث کی۔ دوسری طرف کارل مارکس کی داس کیپٹل کی تین ضخیم جلدوں میں بھی اجتماعی ارتقا کے چند قوانین اور سرمایہ داری کی ناانصافیوں کے بارے میں تو ڈھیروں مواد ملتا ہے' لیکن منصوبہ بندی کے ادارے کا' جو سوشلسٹ نظام کی بنیاد بنا' دور دور تذکرہ نہیں ہے۔ سوشلزم کی معیشت کی شکل تو بیسویں صدی میں اس وقت بنی' جب ماہرین معاشیات آسکر لانگے Oskar Lange (م۔ ۱۹۶۵) اور ہنری ڈکنسن Dicknson Henry (م۔ ۱۹۶۸) نے مائی سز (Mises) کی تنقید کا جواب دیا۔ اس کے بعد سوویت یونین کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مرکزی معاشی منصوبہ سازوں کو جب ایک نئی معیشت قائم کرنے سے واسطہ پڑا انھوں نے اس کے خدوخال واضح کیے۔ ۱۹۱۷ کا بالشویک انقلاب بنیادی طور پر ایک سیاسی واقعہ تھا، جس کا مقصد ریاست کے سیاسی اقتدار کا خاتمہ تھا۔ ۱۹۲۳ سے ۱۹۲۷ تک سوویت ریاست کو ہر چیز کو دوبارہ سوچنا پڑا۔ ۱۹۲۷ میں کمیونسٹ پارٹی اس قابل ہو سکی کہ اپنا پہلا پنج سالہ قابل عمل منصوبہ لے کر آئے۔ علاوہ ازیں سوشلزم کی معیشت پر بھی درسی کتاب روس میں ۱۹۲۸ میں شائع ہوئی۔

تاریخ میں اسی طرح معاملات انجام پاتے ہیں۔ اسلامی تحریک مستقبل کے لیے کوئی بلیو پرنٹ لے آئے، یہ توقع سے بہت زائد ہے۔ یہ بلیو پرنٹ کسی لیبارٹری میں تیار نہیں کیے جاسکتے، بلکہ معاشرے اور معیشت کی مخصوص تجربہ گاہ میں عمل کر کے تیار کیے جاتے ہیں۔ یہی ہمارا مدعا ہے۔

احیاے اسلام اور مغرب

اسلامی تحریکوں کے مغرب سے روابط کے معاملے میں مشکل اصطلاحات کی ہے۔ مغرب صرف جغرافیائی حقیقت نہیں، ایک تصور اور ایک فکر بھی ہے۔ مغربی تہذیب کچھ اصولوں اور اقدار کی علم بردار ہے، جن کا دائرہ عالمی ہو سکتا ہے، میں اس کا انکار نہیں کرتا۔ مگر یہ بات واضح ہے کہ ایک سیاسی اور معاشی حقیقت کے طور پر، مغرب ایک غالب جغرافیائی طاقت ہے اور بدقسمتی سے مغرب اور باقی دنیا گذشتہ چار، پانچ صدیوں سے باہم متصادم ہیں۔ اس عرصہ میں باقی دنیا اور خصوصاً مسلم دنیا کا استحصال کیا جاتا رہا۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں، اس تاریخی پس منظر نے ہمارے رویوں کو متاثر کیا ہے۔

دوسری طرف، اسلام، جغرافیائی نقطہ نظر سے ۵۲ ریاستوں میں اکثریت کا مذہب ضرور ہے، مگر وہ جغرافیائی خطے کے ساتھ بندھا ہوا نہیں ہے۔ وہ ایک نظریہ حیات ہے، ایک مذہب ہے، ایک تہذیبی رویہ ہے، ایک عالمی پیغام ہے۔ اسلام کے پیروکار ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر مسلم اکثریتی علاقوں میں ۸۰ کروڑ مسلمان ہیں تو باقی دنیا میں ۴۰ کروڑ سے زیادہ مسلمان ہیں۔ ان وجوہات سے اسلام کا مغرب سے مقابلہ ایک پیچیدہ اور کثیر الجہتی عمل ہے۔

اسلام اور مغرب کے تعلق کی دو جہتوں پر ضرور غور کرنا چاہیے۔ پہلی، ان اقدار اور اصولوں کا موازنہ، جن کے مغرب اور اسلام، علم بردار ہیں۔ کچھ ایسے دائرے ہیں جہاں دونوں کے درمیان کوئی تنازعہ نہیں ہے، لیکن کچھ دوسرے دائروں میں، ان میں بنیادی اقدار بھی شامل ہیں، ان میں اختلاف ضرور ہے۔ ہمیں اس اختلاف کو کوئی خطرہ یا کوئی ایسی چیز نہ سمجھنا چاہیے جس کا نتیجہ لازماً دشمنی یا تلخی کی صورت میں نکلے، بلکہ اسے صحت مند مقابلے کا اور ایک دوسرے سے کچھ سیکھنے سکھانے کا موقع سمجھنا چاہیے۔ تاریخ میں ایک وقت ایسا تھا کہ جب خیالات و اقدار سیاسی طاقت کے ذریعے مسلط کیے جاتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے۔مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ حالیہ تاریخ کی ایک اہم پیش رفت 'خیالات کا آزادانہ اظہار' اور بحث و مباحثہ اور ابلاغ کی آزادی ہے۔اس پہلو سے 'ہل سنکی (Helsinki) شہری اسمبلی میرے خیال میں ایک نہایت اہم پیش رفت ہے۔اس پس منظر میں ہمیں اسلام اور مغرب کے درمیان صحت مند مکالمے کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے۔

دوسری جہت ' دونوں کے سیاسی ' معاشی اور اسٹرے ٹیجک مفادات سے اور مغربی دنیا کے موجودہ تسلط سے متعلق ہے۔اس حوالے سے میری پہلی درخواست یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی تحریکوں کو مغربی تہذیب کے لیے خطرہ نہیں سمجھنا چاہیے۔اس لیے کہ اسلامی تحریکوں کو اصل فکر اپنے گھر کے حالات درست کرنے کی ہے۔ہمارے پاس سیاسی نظام اور معاشرے کی تشکیل نو کا ایک واضح پروگرام ضرور ہے 'ہمارا مقصد مسلم معاشرہ کی تعمیر نو ہے۔

جیسا میں نے کہا 'ہماری بنیادی کوششیں اپنے گھر کے حالات کو بہتر بنانے پر مرکوز ہیں۔اس ضمن میں کئی عوامل ہمارے موجودہ مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں: (۱) نوآبادیاتی دور کے باقی ماندہ اثرات۔ (۲) مسلم ممالک میں ایسی قیادت جن کے مفادات مغرب کے بعض عناصر کے مفادات سے مطابقت رکھتے ہیں۔(۳) گذشتہ چالیس برسوں میں مسلم دنیا کی سیکولر قیادت کی اپنے معاشرے کی خدمت ' اپنے عوام کی تمناؤں کی تکمیل ' ان کے سامنے جواب دہی 'اور ان کے لیے آزادی اظہار' حقوق انسانی اور سیاسی عمل میں شرکت کی فراہمی میں ناکامی۔

ہم مسلم دنیا میں اس قسم کی قیادت کے خلاف کھڑے ہیں۔مغرب کو یہ سوچنا چاہیے کہ مسلم دنیا کی ایسی سیکولر ' بدعنوان اور آمرانہ حکومتوں کے ساتھ ' جن کا زوال لازمی ہے ' وابستگی کہاں تک مغرب کے مفاد میں ہے۔آخر مغرب کو ان اسلامی تحریکوں سے کیوں الرجی ہو جو اپنے اپنے ملکوں میں آمرانہ حکومتوں کے خلاف نبرد آزما ہیں۔

کوئی مسلمان ملک 'کوئی مسلمان قوم 'کوئی اسلامی تحریک یورپ 'چین ' جاپان ' امریکہ یا کسی اور ملک کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ہم تو صرف اپنی مملکتوں کی آزادی چاہتے ہیں تاکہ ہمارے عوام کی مرضی اور مفادات صاف ستھرے سیاسی عمل کے ذریعے حاصل کیے جاسکیں۔جہاں تک مغربی ممالک کے اسٹرے ٹیجک مفادات کا تعلق ہے ' خواہ یہ تیل ہو یا بری ' بحری اور فضائی راستے ہوں ' خام مواد ہو یا ضروری اشیا اور بین الاقوامی تجارت ہو ' ہم چاہیں گے کہ تبادلہ خیال ہو تاکہ ان امور میں تنازعات گفت و شنید سے طے کیے جاسکیں۔

خود مغرب کے اندر تنازعات موجود ہیں۔امریکہ اور یورپی برادری میں کئی مسائل پر ٹھنی ہوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے، اور بعض اقتصادی امور پر امریکہ اور جاپان میں ناخوش گواری ہے۔ جنوبی اور شمالی امریکہ میں اور امریکہ اور کینیڈا میں بھی مسائل ہیں۔ ان تمام مسائل کو حل کرنے کے لیے بات چیت، تبادلہ خیال اور ایک دوسرے کے موقف کے لیے گنجایش پیدا کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، اور کامیابی کے روشن امکانات ہیں۔ یہی حکمت عملی مسلم دنیا کے ساتھ کیوں نہیں آزمائی جا سکتی۔ یہ کیوں ضروری ہے کہ تیل کے ذخائر پر براہ راست فوجی کنٹرول ہو۔ کیا مغربی ممالک کو تیل کی فراہمی برقرار رکھنے کا صرف یہی ذریعہ ہے؟ تیسری دنیا کے ممالک کو بھی، بشمول مسلم ممالک کے، یہ حق ہونا چاہیے کہ اپنی اشیا کے لیے مغربی مارکیٹ میں جگہ حاصل کر سکیں۔ مفادات دو طرفہ ہیں، جن کی تفصیل طے کی جانا چاہیے۔

اسلام اور جمہوریت

اسلامی تحریکوں پر مطلق العنانیت اور فاشسٹ ہونے کا الزام بھی لگایا جاتا ہے۔ ہمیں ان الزامات کا غیرجانب داری اور انصاف پسندی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے۔

یقیناً مغربی جمہوریت کے بارے میں فلسفیانہ اور اخلاقی سطحوں پر ہمارے بعض سوالات اور تحفظات ہیں: جدید سیکولر جمہوریت، تصوراتی لحاظ سے دیکھا جائے تو انسان کے مقتدر اعلیٰ ہونے کے اصول پر قائم ہے۔ اس کے برخلاف اسلام اللہ تعالیٰ کو مقتدر اعلیٰ اور انسان کو اس کا نائب تسلیم کرتا ہے، وہ زمین کا مالک و مختار نہیں ہے۔

جہاں تک ہدایت الٰہی کا اور اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے قوانین کا تعلق ہے، وہ بالادست ہیں۔ انسان کی آزادی، اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی حدود کے اندر ہے۔ اسلام کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ اس کی حدود میں قانون کی بالادستی کا اصول رائج ہو گا۔ یہی جمہوریت کا اصل الاصول ہے۔

اسلام میں حقوق انسانی کسی صاحب اختیار کی طرف سے دی گئی رعایتیں نہیں ہیں، بلکہ ان کی ضمانت خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے، اور اسی حیثیت میں وہ اسلامی نظام کا لازمی حصہ ہیں۔ اسلام، مشاورت سے اجتماعی امور طے کرنے کے اصول کو سیاست، معاشرت، ہر مقام اور ہر سطح پر، مرکزی مقام دیتا ہے۔ مثال کے طور پر، پاکستان کی اسلامی تحریک پہلے ہی دن سے بالغ رائے دہی اور مرد عورت، مسلم غیر مسلم، معاشرے کے ہر فرد کے لیے ووٹ کے حق کی علم بردار ہے۔ ہم نے تو یہاں تک کہا ہے کہ جب قانون سازی کا بنیادی ماخذ قرآن و سنت ہونا طے کر لیا جائے، تو ہر مذہب کے ماننے والے صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں منتخب کیے جا سکتے ہیں۔

یہ بات تسلیم کی جانی چاہیے کہ اسلامی تحریک نے، بالواسطہ یا بلاواسطہ، نمایندہ سیاسی اداروں اور انتخابی عمل کے ذریعے حکومت کی عوام کے سامنے جواب دہی کے اصول کو تسلیم کیا ہے۔ مقننہ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انتظامیہ، اللہ کی حاکمیت، شوریٰ اور جواب دہی کے اصولوں کی بنیاد پر جو طریقے مناسب سمجھیں اختیار کر سکتی ہیں، خواہ انھیں کوئی بھی نام دیا جائے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، جمہوریت کی فلسفیانہ بنیادوں کے بارے میں ہمارے تحفظات ہیں۔ لیکن جہاں تک جمہوری عمل کا تعلق ہے، اسلامی تحریک اسے تسلیم کرتی ہے۔ مغرب کے بہت سے لوگ اسلامی تحریک کے جمہوری ذرائع سے منتخب ہونے پر خطرے کی جھنڈی بلند کر دیتے ہیں۔ یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اگر الجیریا، یمن، ترکی اور پاکستان میں اسلامی تحریک کامیاب ہوئی تو یہ آیندہ انتخابی عمل کو نہ چلنے دے گی۔ اس طرح کے الزامات اور اندیشوں کا کوئی جواز یا بنیاد نہیں ہے۔

امر واقعہ تو یہ ہے کہ ترکی، الجیریا اور پاکستان میں اور دوسرے ملکوں میں سیکولر قیادت نے جمہوری عمل کو سبوتاژ کیا ہے، نہ کہ اسلامی تحریک نے۔ مصر میں سیکولر مطلق العنان حکمرانوں نے، مغربی جمہوریتوں کی مکمل حمایت سے، جمہوری عمل کو سبوتاژ کرنے میں کسی تکلف سے کام نہیں لیا۔ حال ہی میں الجیریا میں یہی کچھ ہوا ہے۔ لیکن مغرب میں کسی نے الجیریا میں فوج کی، انتخابات میں دھاندلی کرنے پر مذمت نہیں کی۔ اسی طرح مغرب کو آمریت پر، مثلاً انڈونیشیا میں، فلپائن میں اور ہیٹی میں، کوئی اعتراض نہیں ہے، جب تک وہ ان کے مفادات پورا کرتی رہے۔ اس پر ہمیں سب سے زیادہ پریشانی ہے۔ جب مغرب ہمارے ممالک میں جمہوریت کی دہائی دیتا ہے تو ہم قدرتی طور پر محتاط ہو جاتے ہیں۔ حقیقی جمہوری حکومتوں کی حمایت کرنے میں مغرب کی پالیسی یکساں نہیں ہے۔

دہشت گردی

ایک اور مسئلہ تشدد اور دہشت گردی کا ہے۔ کوئی بھی شخص، خصوصاً وہ جو دنیا کے بارے میں اخلاقی نقطہ نظر رکھتا ہے، دہشت گردی کو جائز نہیں سمجھتا۔ قرآن کہتا ہے کہ ایک آدمی کو ناحق قتل کرنا ایسا ہے جیسے سارے انسانوں کو قتل کرنا، اور ایک بے گناہ کی جان بچانا ایسا ہے جیسے پوری انسانیت کو بچا لینا (المائدہ ۵: ۳۲)۔ یہی میرا ایمان ہے۔ اسلام دہشت گردی کی نہ اجازت دیتا ہے اور نہ حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ہمیں حیرانی مغرب کے اس رویے پر ہوتی ہے کہ دہشت گردی کے اصل اسباب اور واقعات کی تفتیش کیے بغیر، یا محض اکا دکا واقعات کی بنیاد پر، تمام مسلمانوں اور اسلامی تحریکات کو دہشت گرد قرار دے دیا جاتا ہے۔ جب اسلامی تحریکوں کو ریاستی ظلم و ستم کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تو مغرب اسے دہشت گردی قرار دے کر اس کی مذمت نہیں کرتا۔ گذشتہ ۴۰ برسوں میں اسلامی تحریکیں ریاستی دہشت گردی کے مختلف مراحل سے گزری ہیں، جو مغرب کے دوست سیکولر حکمرانوں نے کیں۔ اہل کشمیر کا حق خود ارادیت ایک اور مثال ہے۔ غیروابستہ تحریک نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اگر کوئی قوم آزادی یا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خود ارادیت کا انتخاب کرتی ہے' خواہ اس کے لیے طاقت استعمال کرنا پڑے' تو اسے دہشت گرد قرار نہیں دیا جاسکتا۔ پھر بھی کچھ لوگوں نے خصوصاً انڈیا میں رہنے والوں نے اہل کشمیر پر دہشت گردی کا الزام رکھا' حالانکہ کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے۔ اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق اس کے باشندوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنا باقی ہے۔

دہشت گردی انفرادی عمل ہے اور اجتماعی بھی۔ یہ مشرق میں' مغرب میں' اور دنیا میں ہر جگہ ہو رہا ہے۔ کل ہی میں فلوریڈا کے بارے میں ایک اخباری رپورٹ پڑھ رہا تھا' جس میں گذشتہ سال کے دوران قتل' آبروریزی اور مجرمانہ حملوں کے ۴۳ ہزار دو سو واقعات کا ذکر ہے۔ نیویارک کا ریکارڈ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح کے واقعات کراچی' بمبئی اور تیسری دنیا کے دوسرے شہروں میں ہو رہے ہیں۔ ہمیں اس پر دکھ ہے' لیکن ایسا کیوں ہے کہ جب اسلام اور مسلمانوں کا معاملہ آتا ہے' تو ایک مجموعی رویہ اپنا لیا جاتا ہے۔ ہم سب کو اس بات سے اتفاق ہونا چاہیے کہ جہاں کہیں بھی دہشت گردی ہے' اس کے دیرپا حل تلاش کرنے کے لیے ہمیں ان حالات کو سمجھنا چاہیے۔

آخر میں اپنی گفتگو ختم کرتے ہوئے' میں آپ کو دعوت دوں گا کہ آپ اسلامی تحریکوں کے بارے میں اسی حیثیت سے غور کریں کہ' یہ قابل لحاظ اجتماعی مذہبی اخلاقی تحریکیں ہیں' جن کا نصب العین اپنے معاشروں کی تشکیل نو ہے۔ جان اسپوزیٹو (Esposito) اور بعض دوسرے اہل علم نے بجا طور پر نشاندہی کی ہے کہ اسلامی تحریکوں کے اندر بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ ان سب کو ایک قرار دینا غلطی ہے۔ اسی طرح مغرب بھی ایک ہم آہنگ اکائی نہیں ہے۔ اس میں متعدد گروپ' مختلف آرا' رویے اور رجحانات شامل ہیں۔ مغرب کے کچھ لوگ اسلامی تحریکوں کو' بلکہ اسلام کو' ایک نئے آسیب کے طور پر پیش کر رہے ہیں' جو سرد جنگ کے اختتام پر کمیونزم کے زوال کے بعد بین الاقوامی دشمن کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ مغرب میں ہی ایسے دوسرے لوگ ہیں جو اس نقطہ نظر پر تنقید کر رہے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کو سمجھنے کے لیے زیادہ معقول اور شائستہ رویہ اپنانے کے داعی ہیں۔ اس لیے یک رخے رویے کو ترک کرنا یقیناً دانش مندی کی بات ہوگی۔

میں یہ بھی عرض کروں گا کہ اسلامی تحریکیں ابھی نشوونما کے دور سے گزر رہی ہیں اور انھوں نے ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔ تسلسل ان کا بنیادی وصف ضرور ہے' مگر وہ مختلف بھی ہیں۔ ان میں لچک ہے۔ لیکن وہ اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کرتیں' وہ اپنی تدابیر' حکمت عملی' طریق کار اور بر سرزمین پیش آمدہ مشکلات کے مناسبت کے معاملات میں نہایت لچک دار ہیں۔

میں اس بات پر بھی زور دینا چاہوں گا کہ وہ مغرب سے مکالمہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کسی گھمنڈ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مبتلا نہیں ہیں ، نہ وہ دنیا سے الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں۔ انھیں اس کا ادراک ہے کہ دنیا ایک عالمی بستی بنتی جا رہی ہے۔ ہمیں زندہ رہنا ہے ، اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم سب اپنے علمی ، سیاسی معاشی اور اجتماعی مسائل میں انسانی رویے اپنائیں۔

میں کامل انکساری سے یہ بھی عرض کروں گا کہ اسلام نے آغاز ہی سے دنیا اور اس کے لوگوں کے ساتھ کثیر جہتی رویہ اپنایا ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہی الحق ہے ، لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ تمام پیغمبر یہی پیغام لے کر آئے تھے ، خواہ قرآن میں ان کے نام آئے ہوں ، یا نہ آئے ہوں۔ خدا نے لوگوں کو یہ آزادی دی ہے کہ وہ اس کے وجود کا انکار کر دیں ، اور جو اس کے وجود کا انکار کریں ، دنیا میں زندہ رہنے کا ان کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ انکار نہ کرنے والوں کا ، گو کہ اسلامی نقطۂ نظر سے وہ آخرت میں اپنے کیے کا خمیازہ بھگتیں گے۔ اس طرح اسلامی رویہ ' کثیر الجہت رویہ ہے۔ اسلام اہل کتاب ، یعنی عیسائیوں اور یہودیوں کی مسلمانوں سے قربت کو ، اور کم سے کم دو معاملات میں خصوصی تعلقات کو ، تسلیم کرتا ہے۔ شادی اور ہم طعامی۔ اسلام اس امر واقعہ کو تسلیم کرتا ہے کہ اہل کتاب خاتون مسلمان خاندان کی رکن ہو سکتی ہے اور اسے مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اہل کتاب اگر اپنی دینی روایت پر قائم ہوں تو ان کے ساتھ کھانا کھانے کی بھی اجازت ہے۔ یقیناً یہ اسلام کے کثیر الجہت رویے کا حصہ ہے۔

میرا خیال ہے کہ سیاسی اور معاشی مسائل کے بارے میں بھی مسلمان کثیر الجہت ہیں۔ اس تصور میں کہ ایک یکساں نظام ، تہذیب یا ثقافت دنیا کے معاملات میں غالب کردار ادا کرے ، استعماریت کی بو آتی ہے۔ سرد جنگ کے اختتام کا مطلب یک قطبی دنیا کی پیدائش ، مغربی آزادروی کی فتح اور نتیجتاً تاریخ کا اختتام نہیں ہے۔ مغربی دنیا کے بعض حصوں میں ہم یہ سن رہے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہماری طرف سے ، اور مغربی ممالک کی طرف سے ، زیادہ کثیر الجہتی رویہ شاید دنیا کو رہنے کے لیے بہتر جگہ بنا دے گا۔ میں اس راؤنڈ ٹیبل کو یہی پیغام دینا چاہوں گا۔

© rasailojaraid.com